

غلام عباس امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لاہور میں تعلیمی سلسلہ مکمل کیا اور انٹر اور علوم شرقیہ کے امتحانات پاس کیے۔ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۲۵ء سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ”وطن“ ہے جو نالٹائی کے افسانہ سے ماخوذ ہے۔ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء وہ غیر ملکی افسانوں کے ترجمے کرتے رہے۔ ان کا سب سے پہلا طبع زاد افسانہ ”مجسمہ“ تھا جو ”کاروان“ کے سالنامہ میں شائع ہوا۔

۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۷ء وہ امتیاز علی تاج کے بچوں کے رسالے ”پھول“ اور خواتین کے رسالے ”تہذیب نسواں“ کے مدیر رہے۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور اس کے ہندی اور اردو رسالوں ”آواز“ اور ”سارنگ“ کے مدیر بھی رہے۔

قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ ۱۹۳۸ء میں پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں نقد انعام سے نوازا۔ حکومت کی جانب سے انھیں ”ستارہ امتیاز“ کا اعزاز بھی دیا گیا۔

غلام عباس کی اہم تصانیف میں ”گوندنی والاکئی“ (ناول)، ”دھنک“ (ناولٹ)، ”آمنڈی“، ”کن رس“، ”جاڑے کی چاندنی“، ”الہرا کے افسانے“ اور ”جزیرہ سخن دران“ (فرائیسی افسانوں سے ماخوذ) شامل ہیں۔

اردو افسانہ نگاری میں غلام عباس کا مقام اہم اور منفرد ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں ترقی پسندانہ رجحانات ملتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی صداقت اور فن کی لطافت کو یکجا کر کے نہ صرف اردو افسانے کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اس میں اپنی شخصیت کا رنگ بھر کر اسے ترقی کی راہ پر گامزن بھی کیا۔

غلام عباس اپنے کرداروں کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ وہ انھیں مثالی بنا کر ان کی شخصیت پر خیر و شر کی چھاپ لگانے کے قائل نہیں بلکہ جو کچھ ہمارے معاشرے میں ایک عام انسان کے ساتھ ہو گزرتا ہے وہ سب کچھ ان کے کرداروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں انتہا پسندی یا مثالیت کے بجائے فطرت انسانی کی عکاسی ملتی ہے۔ بقول ن۔ م۔ راشد ”غلام عباس ایک پُر امن اور پُر آہنگ گھریلو زندگی کے فن کار ہیں۔ ان کے فن میں زندگی کے رنگارنگ مسائل کا احساس ملتا ہے۔“

غلام عباس موضوع کی تلاش بڑی باریک بینی سے کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تک کسی موضوع کو احاطہ تحریر میں نہیں لاتے جب تک کہ وہ فکر اور جذبہ کی بھٹی میں تپ کر کندن نہ بن جائے۔ وہ اپنے وسیع مشاہدے کی بدولت اپنی تحریروں کو خوب نکھارتے ہیں۔

افسانہ ”کتبہ“ بھی ان کے وسیع مشاہدے اور باریک بینی کی مثال ہے۔ وہ ایک سنگ تراش کی دکان پر ایک سنگ مرمر کا ٹکڑا جس پر کسی ایک شخص کا نام کندہ ہے دیکھتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اسے دکان، مکان یا دفتر کے دروازے پر کہاں لگایا جائے۔ پھر وہ سوچتے ہیں کہ اگر ایک غریب شخص کے دن پھر جائیں اور وہ اپنا مکان بنائے تو وہ اس کتبے کو مکان کے دروازے پر لگائے گا۔ انھی تصورات کے نتیجے میں وہ یہ افسانہ لکھتے ہیں جس کے اختتام پر مکان نصیب نہ ہونے کے باعث یہ کتبہ اس کی قبر پر لگ جاتا ہے۔

غلام عباس کے انتقال کے ساتھ ہی اردو افسانہ نگاری کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ بقول شوکت صدیقی ”غلام عباس کے ساتھ ہی اردو افسانے کا ایک عہد ختم ہو گیا۔ وہ عہد جو پریم چند سے شروع ہوا اور غلام عباس پر اختتام پذیر ہوا وہ اس بزم کے آخری چراغ تھے۔“

کتابتہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہفت فضا باغوں اور پھولاریوں میں گھری ہوئی، قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چٹکی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہوا دریا اپنے ساتھ بہت سا خشک و خاشاک بہالایا ہو۔

گرمی کا زمانہ نہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جھلے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا آنکرات اٹھ رہے تھے۔ شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھانک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔ گھر کو لوٹنے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلاف معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد بھی اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھاتی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی ستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اٹاشہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی، اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلتی شروع ہوئیں۔ ان میں ٹائپسٹ، لمریکارڈ کیپر، ڈسپنچر، اکاؤنٹنٹ، کم ہیڈ کلرک، سہ سپرنٹنڈنٹ، غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپسٹ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستنیوں کی قمیص، خاکی زین کی نیکر اور چپل پہنے سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے رنگ دار چشمہ لگائے بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گھٹیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سلجھا سکے ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سوچ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گڑبستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انہیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انہیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض مچھلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کا ندھ پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انہوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تر ہر نظر آتے تھے۔ نئے رنگ روٹ سے سارے سلائے ڈھیلے ڈھالے بد قطع سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکلائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو

۱- Typist ۲- Record Keeper ۳- Despatcher ۴- Accountant ۵- Head Clerk

۶- Superintendent ۷- Type

تین تین فونٹین پن اور پٹسلیم لگائے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔

گوان میں زیادہ تر کڑکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اسکتی ہے بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ بات چیت کر کے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کڑکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے نا تجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی سکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگ بھی جن کی ناک پر سا لہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے غم سا آگیا تھا اور گند استروں سے متواتر ڈاڑھی موٹھتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڈی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار مٹھی مٹھی پھنسیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہترے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کتنے گئے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ تانگا چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف حسین نے انکئی نکال کر کوچان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرد گرد ہر روز شام کو کھنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سالگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیزیں خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پر لطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچر باز حکیموں، سنیا سیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹو گرافروں کے جھگڑوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلتا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا جس سے وہ بے کار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گل دان، نیل لیمپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیڑیاں، چوکھٹے گراموفون کے کل پرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھینگ، بدھ کا نیم قد مجسمہ.....

ایک دکان پر اس کی نظر سب مرم کے ایک کھڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ درہی سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوافٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس کھڑے کو اٹھا کر دیکھا۔ یہ کھڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

”تین روپے“ کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے کھڑا رکھ دیا اور چلے لگا۔

”کیوں حضرت چل دیے؟ آپ بتائیے کیا دیجیے گا؟“

وہ رک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوق تحقیق کو پورا کرنے کے

لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا، دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکان داروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

”ہم تو ایک روپیہ دیں گے“ یہ کہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اس نے مہلت ہی نہ دی۔

”اجی سینے تو کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سواروپیا بھی نہیں..... اچھا لے جایے۔“

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ ٹکڑے کے درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے..... یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ ٹکڑے ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خریدتا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا جوش اور ترقی کا دلولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا مگر دو سال کی سعی لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آ چلا تھا مگر اس سنگ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہل چل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئند خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوش نمائیلیں بنادیں۔

اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدایا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبے پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں وہ اس کتبے کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے اس کے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبے کی دلکش تحریر پر گاڑے دیرے دیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی۔ قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے دروازے کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ اس پر کوئی بورڈ لگا یا جاسکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس

تسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے چھانک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے۔

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبے کو کہاں رکھوں۔ اس کے حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے۔ بالآخر اس نے کتبے کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبے ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تنگن کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جو یا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔ جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا آرزوئیں اس کے سینے میں بھجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہ لطف و کرم کا نشا سے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کے بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں گمن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آ جاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرجہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔ کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبے کو گرانہ دے اسے وہاں سے اٹھالیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اُس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو گرم کپڑے رکھنے کے لیے اس کے صندوق میں سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانا پڑتی۔

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام دلو لے نکل چکے تھے اور کتبے کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجہ اول کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تا نگا اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی خریدی۔ میز کے آتے ہی اسے پھر کتبے کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی انگلیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی بیٹی میں سے کتبہ نکالا صابن سے دھویا پونچھا

اور دیوار کے سہارے میز پر لگا دیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت ٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سامان کا کام بھی کر دیتا۔ گھر پر آدمی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بھجھ سا جاتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے..... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے..... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے.....

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا۔ البتہ شریف حسین کو اپنی پرانی جگہ پر آ جانا پڑا۔

اس کے بعد جودن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوش حالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ اہتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آکس اور حرکات میں سستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بے زار بے زار سار رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چلتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور اسے جلد ہی راہ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چھٹی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پر دنا سیکتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جما لیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہٹنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔ سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصے میں کتبے نے کئی جگہیں بدلیں۔ کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا۔ اٹھا کر دھویا، پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گلے رکھ دیے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدناما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دھک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوش حالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہرہاں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آدم بھر میں ان تصورات کو اڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی لڑکوں کی تعلیم اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش..... یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ بل بھر کو بھی اس کے خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

بچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنل میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کر دی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دباننا شروع کر دیا اور زیادہ تر چار پائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پیش و وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہترے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہودن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کر رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں سے اسے یہ کتبہ مل گیا۔ بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی۔ کتبے پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوچھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی۔

اگلے روز وہ کتبے کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبے کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کر دیا۔

(آندی)

مشق

- 1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:
 - i- کلرکوں میں کس عمر کے لوگ شامل تھے؟
 - ii- شریف حسین اس دن گھر کے بجائے جامع مسجد کی طرف کیوں چل پڑا؟
 - iii- شریف حسین نے سنگ مرمر کے کھڑے کا کیا مصروف سوچا؟
 - iv- سنگ مرمر کے کھڑے پر اپنا نام کھدوا دیکھ کر شریف حسین نے کیا محسوس کیا؟
 - v- شریف حسین نے کتبہ کہاں رکھا؟
- 2- سبق کے حوالے سے مندرجہ ذیل جملوں کی وضاحت کریں:
 - i- دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہما عموماً کمروں کی چار دیواری ہی میں محدود رہتی ہے۔
 - ii- دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔
 - iii- وہ بڑا غفور الرحیم ہے کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔
 - iv- دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جو یا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں۔
 - v- ترقی لطیفہ فیہی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

3- مندرجہ ذیل جملوں کی تکمیل کے لیے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب کے سامنے (✓) کا نشان لگائیں۔

i- شریف حسین کو سنگ مرمر کا ٹکڑا.....

ا۔ وراثت میں ملا

ب۔ راستے میں پڑا ہوا ملا

ج۔ کسی دوست کی طرف سے تحفے میں ملا

د۔ کباڑی کی دکان سے ملا

ii- شریف حسین نے سنگ مرمر کا ٹکڑا اس لیے خریدا کہ.....

ا۔ اس کی بیوی نے فرمائش کی تھی۔

ب۔ اس کی قیمت بہت کم تھی۔

ج۔ وہ اسے اپنے گھر کے دروازے پر نصب کرانا چاہتا تھا۔

د۔ قیمت پوچھنے پر کباڑی اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

iii- شریف حسین کے خیال میں سنگ مرمر کا مصرف یہ تھا کہ.....

ا۔ اسے افسر کو تحفے کے طور پر دے دیا جائے۔

ب۔ اسے کارنس پر سجا دیا جائے۔

ج۔ اس پر اپنا نام کھدوا کر مکان کے دروازے پر لگا دیا جائے۔

د۔ اسے مطالعے کی میز پر رکھ دیا جائے۔

iv- شریف حسین کی موت کے بعد سنگ مرمر کا ٹکڑا.....

ا۔ یونہی گھر میں پڑا رہا

ب۔ کہیں گم ہو گیا۔

ج۔ بیچ دیا گیا

د۔ اس کی قبر پر لگا دیا گیا۔

4- ”کتبہ“ کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیں۔

5- غلام عباس پر سوانحی و تنقیدی نوٹ لکھیں۔

6- اس افسانے سے کیا اخلاقی سبق حاصل ہوتا ہے؟

7- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

مستقبل، معمول، اٹاش، ادنیٰ و اعلیٰ، بے مصرف۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کے لفظ ڈراؤ (DRAU) سے مشتق ہے جس کے معنی ”کر کے دکھانا، حرکت یا عمل“ ہے۔ ڈراما ایک ایسی افسانوی مصیبت ادب ہے جس میں ایک مکمل کہانی، کرداروں کے عمل اور حرکات سے سٹیج پر مکالموں کے ذریعے پیش کی جاتی ہے۔ ڈراما نویس کو کرداروں کی تخلیق کرتے ہوئے واقعات اور ان کی جزئیات کی وضع و ترتیب کے وقت، مکالمے لکھتے ہوئے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے غرض کہ ڈراما لکھنے کے دوران میں ہر ہر قدم پر اس امر کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ وہ قارئین کے لیے نہیں بلکہ ناظرین کے لیے لکھ رہا ہے۔ کہانی پڑھی نہیں جائے گی بلکہ اسے ایک خاص قسم کے سٹیج پر قماشائیوں کے لیے کھیلا جائے گا اور ڈراما اسی وقت کامیاب سمجھا جائے گا جب وہ سٹیج پر عمدگی سے کھیلا جاسکے۔

ڈرامے کے عناصر ترکیبی کا اہم جز پلاٹ ہے۔ ڈراما نگار کے پاس محدود وقت ہوتا ہے اور اسے اس محدود وقت میں پوری کہانی کرداروں کے عمل اور مکالموں کے ذریعے سے بیان کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے ڈراما نگار کا فرض ہے کہ وہ پلاٹ کی مختلف کڑیوں کو اچھی طرح مربوط کرے تاکہ کسی مقام پر بھی ڈرامے کی کہانی میں غلطی کا احساس پیدا نہ ہو۔ ڈراما نگار کو کہانی کا انتخاب کرتے وقت سمجھداری کا ثبوت دینا چاہیے۔ کہانی کے واقعات میں جدت اور ندرت ہونی چاہیے کیوں کہ غیر دلچسپ اور فرسودہ واقعات ناظرین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول نہ کرا سکیں گے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ڈراما نگار کا تخیل بلند ہو۔

کردار نگاری بھی ڈرامے کا ایک اہم جز ہے جس پر کہانی کا زیادہ تر انحصار ہوتا ہے۔ ڈرامے کے کردار جس قدر بھرپور ہوں گے اسی قدر وہ ڈرامے کی کہانی کے تاثر کو گہرا کرنے کا باعث بنیں گے۔ ناول اور افسانے میں ادیب کرداروں کی ذہنی اور قلبی کیفیات کو الفاظ میں بیان کر سکتا ہے لیکن ڈرامے میں یہ کام کرداروں کو کرنا پڑتا ہے۔ انھیں اپنے دکھ، غم و خوشی کے تاثرات چہرے پر مختلف تاثرات ابھار کر ہاتھ پاؤں کی حرکات سے واضح کرنے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھی اور اعلیٰ کردار نگاری ہی ڈراما نگاری کا کمال سمجھی جاتی ہے۔

ڈرامے کی تمام کہانی مکالموں کی صورت ہی میں ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ ڈراما نگار کا فرض ہے کہ وہ موقع محل کے مطابق ہر کردار کی گفتگو اس کے مقام و مرتبے کو ملحوظ رکھ کر کرے۔ ہر کردار کی گفتگو میں حقیقت کا رنگ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ فطری انداز میں گفتگو کرے۔ روزمرہ زندگی میں لوگ بے شکوہ الفاظ اور معنی دہن و سخن زبان میں گفتگو نہیں کرتے ہیں۔ ڈرامے کے کرداروں کو بھی اس سے گریز کرنا چاہیے۔ اسی طرح غیر ضروری اور طویل مکالموں سے بھی پرہیز ضروری ہے۔ موسیقی بھی ڈرامے کا ایک ضروری جز ہے۔ بعض اوقات پس پردہ موسیقی کو کوئی کلام مکالموں سے زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ خاص طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے تو موسیقی کے بغیر ممکن ہی نہیں کیوں کہ پس منظر کی موسیقی ڈرامے کے تاثر کو گہرا کرتی ہے۔

ڈراما نویس کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ناظرین میں نقادوں سے لے کر عوام و خواص ہر سطح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو ڈرامے کی فنی نزاکتوں اور لطافتوں پر نظر رکھتے ہیں اور وہ بھی جن کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو ڈراما نگار اپنے ان دونوں طرح کے ناظرین کا خیال رکھتا ہے وہی کامیاب ڈراما نگار ہے۔

ڈرامے کی اہم ترین قسمیں المیہ اور طریبہ کہلاتی ہیں۔ المیہ ڈراما وہ ہے جس میں تصادم اور کشش کی بنیاد شان دار اور اعلیٰ انسانی عمل پر ہو مگر اس کا انجام اس کے اہم کرداروں کی شکست یا موت کی صورت میں ہو۔ طریبہ ڈراما وہ ہے جو زندگی کی ناہمواریوں اور کرداروں کی کوتاہیوں کو مزاح کے رنگ میں پیش کرے اور اس کا انجام خوشی کی صورت میں ہو۔ ادبی اصطلاحوں میں ڈرامے کو کہتے ہیں یا ایک ایک کا وہ ڈراما ہے جس میں فن کے سارے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے ایک واقعہ کو ایک ہی ایکٹ میں بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ایسے ڈرامے میں کردار اور مناظر کی کمی ہوتی ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بعد ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد کے بعد ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجاد کے لیے بھی ڈرامے لکھے جانے لگے۔ ریڈیو پر ڈرامے کی پیشکش نسبتاً مشکل عمل ہے کیونکہ اس پر مناظر دکھائی نہیں دیتے۔

اردو میں پہلا ڈراما ”اندر سما“ کے نام سے ۱۸۵۴ء میں سٹیج کیا گیا۔ بعد میں کئی تھیٹر ٹیکل کمپنیاں قائم ہوئیں جن میں رونق بھاری، میاں حسینی، طالب بھاری اور احسن لکھنوی وغیرہ ڈراما نگار تھے لیکن آغا حشر ایسے ڈراما نگار ہیں جو نصف صدی تک تھیٹر پر چھائے رہے۔ انھوں نے بڑے خوب صورت ڈرامے لکھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں احمد شجاع پاشا کا ”پاپ کا گناہ“ اور امتیاز علی تاج کا ”انارکلی“ بہت مشہور ہوئے۔ ریڈیو پر لکھنے والے ڈراما نگاروں میں اشتیاق حسین قریشی، عبدالمجید ملک، شاہد احمد دہلوی، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، باقی صدیقی، امرا، اہم مجلس اور آغا بابہ جیسے ادیب شامل ہیں۔ میرزا ادیب بھی ڈرامے کی دنیا کا ایک اہم نام ہے۔ ٹی وی کے ڈراما نگاروں میں ہالو قدیر، اشفاق احمد، احمد اسلام، امجد، عطاء الحق قاسمی، جمیل ملک، ڈاکٹر انور سجاد، حسینہ معین، یونس جاوید، فاطمہ ثریا بیجا، سلیم چشتی، عبدالقادر جو نیچو اور منو بھائی قابل ذکر ہیں۔